عصر حاضر میں جہاد وقتال

غزواتِ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہد کے تناظر میں

''اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے غلبہ چاہتا ہے''۔ یہ فقرہ آج ایک خاص تصور دین کا عکاس ہے۔ عہد حاضر میں مختلف نظاموں کی کشاکش کے درمیان، جبکہ ہر قوم اپنے افراط وتفریط پر مبنی مادی اور خدا سے بیزار نظام حیات کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتی ہے۔ مسلمان بھی ایک نظام حیات کے دعوے دار ہیں، جس کی ترتیب وتدوین وحی ورسالت کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اور اسی پر عمل پیرا ہو کر انہوں نے اس دنیا پر کئی صدیوں تک حکومت کی ہے۔ اسی فکری ونظری شعور کے نتیجے میں تمام بلادِ اسلامیہ میں مختلف تحریکات غلبہ واقامت دین اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی آرزو لے کر میدان عمل میں آتی رہی ہیں۔ اس طرح اُمت مسلمہ کے فکری قائدین نے اس قافلہ کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور احیائے اسلام کا عمل جاری رہا۔

عہد حاضر میں غلبہ واقامت دین کے لیے کام کرنے والی ان تحریکات کو تقریباً ایک صدی مکمل ہونے کو ہے۔ مگر دنیا میں حقیقی طور پر کوئی قابل ذکر تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ یعنی جو نتائج مطلوب تھے وہ حاصل نہیں ہوئے۔ سوائے اس کے کہ ان تحریکات کے پرچم تلے مسلم معاشروں میں کچھ صالحین اکٹھے ہو گئے۔ ایسے متضاد نتائج کے سامنے آنے پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اپنے کام پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے اور خامیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کرتے ہوئے مستقبل کے لیے خود احتسابی کے ساتھ پر جوش انداز میں سرگرم رہتے۔ مگر ان تحریکات کے کچھ پر جوش اور سرگرم عناصر اپنے گذشتہ معتدل اور محتاط طریقہ کار کے بارے میں نا اُمید ہو گئے۔ اور شکوک وشبہات کا شکار ہو کر جلد بازی میں ایک نئی راہ اختیار کی جو کہ ہمہ گیر اسلامی تحریک کو نقصان پہنچانے کا باعث بن رہی ہے۔ اس ہنگامی صورت حال سے قبل عالم اسلام میں احیائی عمل کی ترتیب یوں تھی کہ پہلے دعوت ایمان حقیقی، تزکیہ نفوس، تعلیم کتاب و حکمت، تربیت وتنظیم، پھر جہاد وقتال۔ جبکہ اس جدید طریقہ کار میں بات تکفیر سے شروع ہوتی ہے اور بے نتیجہ قتال کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ اور اس سے اصل استدلال کو شرعی نصوص سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

عصر حاضر میں (غلبہ اسلام کے لیے) جہاد وقتال

اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ چاہے معاملات ہوں یا عبادات، معاشرت ہو یا سیاست و ریاست، عملی راہنمائی کا اصل ماخذ قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کی سیرت وسنت ہے۔ جس طرح یہ اصول دیگر دینی تعلیمات کے لیے صحیح ہے اسی طرح غلبہ واقامت دین یا منصب امامت وخلافت کے طریقہ کار، لائحہ عمل اور منہج انقلاب کے اخذ کرنے کا اولین واہم ترین ذریعہ بھی سیرت رسول ﷺ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے ان مصادر ومآخذ سے متعلق کسی بھی مسلمان کو کوئی اختلاف نہیں لیکن ان تحریکوں کے طریقہ کار میں جو تنوع وتفاوت پایا جاتا ہے یہ دراصل ان قوانین

کے فہم اور ان کی تعبیر وتشریح میں نقطہ نظر میں فرق کی وجہ سے ہے۔

اسلامی قوانین سازی یا فقہ کا یہ اصول ہے کہ جب ہم کسی فعل کے لیے کسی واقعہ سے مثال پیش کرتے ہیں یا واقعہ اُولیٰ کو واقعہ ثانیہ پر قیاس کرتے ہیں تو اس فعل کی صحت و بطلان کا دارومدار دو بنیادی اصولوں پر ہوتا ہے۔ جسے فقہ کی زبان میں اصل اور فرع یا مقیس علیہ اور مقیس کہتے ہیں۔ جب تک ان دونوں اجزاء کی مکمل فہم نہ ہو ان کے استعمال اور اس سے راہنمائی کا کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ اسی اصول کی روشنی میں دعوت وغلبہ اسلام کی کسی بھی تحریک کو کامیابی سے چلانے کے لیے درج ذیل اجزاء کو سمجھنا ضروری ہے۔

۱۔ منہج انقلاب اخذ کرنے کے نقطہ نظر سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت مطہرہ کا مطالعہ۔

۲۔ موجودہ حالات وواقعات کا باریک بینی سے مطالعہ۔

اس میں سے پہلا حصہ اصل یا مقیس علیہ کہلائے گا جبکہ دوسرا حصہ فرع یا مقیس ہوگا۔ یہ دونوں اجزاء اپنی انفرادی حیثیت میں مکمل توجہ کے مستحق ہیں۔ کوئی بھی ثانوی حیثیت کا مالک نہیں۔ اس لیے مطلوبہ مقاصد اسی وقت حاصل ہوں گے۔ جب دونوں نکات کے بارے میں تفصیلی علم حاصل ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو اظہار دین یا اقامت دین کے لیے جو منہج دے کر بھیجا وہ واضح طور پر دو مراحل میں منقسم ہے۔ اور دونوں مراحل اپنی نوعیت، اثرات اور تقاضوں کے اعتبار سے مختلف اور متضاد بھی ہیں۔ یعنی

۱۔ مکی دور ۲۔ مدنی دور

۱۔ مکی دور میں منہج تحریک

اگر مکی دور میں نازل ہونے والی آیات پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو کوئی امر مانع نہیں جو اس تاثر کے اخذ کرنے سے ہمیں روکتا ہو کہ اس دور میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے اپنے نبی ﷺ کو جو منہج اور طریقہ کار دیا گیا تھا۔ وہ دعوت اور تبلیغ ہی کا تھا جس میں ایک خاص درویشانہ رنگ غالب ہے۔ یہ دور جہاد وقتال سے یکسر خالی ہے۔ اور اگر کہیں آیات میں لفظ جہاد استعمال ہوا ہے تو اس کے معنی کوشش اور جدوجہد کے ہیں نہ کہ جنگ وقتال کے۔ اس دور کی کیفیات کا مطالعہ کیا جائے تو چند عناصر بہت واضح ہیں۔ جیسا کہ

۱۔ صبر کرنے کی تاکید

۲۔ جو مصائب دعوت کے دوران پیش آئیں ان پر صبر کی تلقین ہورہی ہے۔ استقامت یعنی اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی تعلیم دی جارہی ہے۔

۳۔ ہر مصیبت کو جھیل جانے کا عزم پیدا کیا جارہا ہے۔

۴۔ برائی کا بدلہ اچھائی سے دیئے جانے پر اُبھارا جارہا ہے۔ تزکیہ نفوس پر زور ہے۔

۵۔ نماز اپنی ابتدائی شکل میں ہے اور اس کی مشق کروائی جارہی ہے۔

۶۔ اخلاق کی تہذیب مطلوب ہے۔

۷۔ حق بات کہنے پر جو ذہنی یا جسمانی اذیت پہنچے اس پر کمال استقامت کی ترغیب اور اس کے نتیجے میں جنت کی خوشخبری دی جارہی ہے۔ (سورہ العصر)

۸۔ ایمان وتقویٰ میں درجہ احسان کی جانب پیش قدمی کے لیے تحریص وتشویق ہے۔

۹۔ سیرت نبوی ﷺ کے اس مرحلہ میں مسلمانوں کی پوری جماعت کو اس بات کی سخت تاکید تھی کہ ظلم کے جواب میں کوئی اقدام نہیں کرنا یعنی مار کھانا ہے مارنا نہیں۔ جان دینا ہے جان لینا نہیں ہے۔

اسی حکم کو بعد میں ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ (النساء:۷۷)

''کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ باندھے رکھو''۔

۲۔ مدنی دور میں منہج تحریک

مکی دور کے منہج کے برعکس ہجرت کے بعد یعنی مدنی دور میں چند اور چیزوں کا اضافہ ہوجاتا ہے جس سے جدوجہد کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔ اب کفار کو نہ صرف ان کے ظلم کا جواب دیا جارہا ہے۔ بلکہ آگے بڑھ کر چیلنج بھی کیا جارہا ہے۔ ان سے دُوبدُو جنگ ہورہی ہے۔ ان کی گردنیں اُتاری جارہی ہیں۔ کفار ومشرکین کو قیدی بنایا جارہا ہے۔ جہاں معاہدہ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے وہاں عہد ومیثاق ہورہے ہیں۔ جہاں عارضی صلح درکار ہے وہاں امن وصلح کی بات چیت ہورہی ہے۔ غرض اس اُبھرتی ہوئی طاقت کے لیے جس وقت جو عمل مناسب ہے وہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ عزوجل نے اسلام کو شوکت سے نواز دیا۔ ہر دور کے تقاضے یکسر مختلف ہیں۔ بظاہر یہ تضاد ہے مگر حکمت دین کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر سیرت کے ان ادوار پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان مراحل کے مابین نسبت تضاد کی نہیں بلکہ تدریج کی ہے۔ ایک مقدم ہے اور ایک موخر ہے۔

ان دونوں مراحل کے مابین اصل فرق یہ ہے کہ مکی دور میں مسلمانوں کی تعداد اور استعداد کم تھی، ان کی تربیت اور تزکیہ و تنظیم کا عمل جاری تھا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کو حکم یہ تھا کہ اسلام کی دعوت اپنے قول وفعل سے دیتے رہیں۔ ایمان کی پختگی اور گہرائی کے لیے سعی پیہم جاری تھی۔ اخلاق کی تہذیب اللہ کے ساتھ عبدیت کے تعلق کو مستحکم کرنے کی کوشش اور درجہ احسان کا حصول اس دور میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ منہج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صبح شام اس مطلوبہ استعداد اور تعداد کو

عصر حاضر میں جہاد

حاصل کرنے کے لیے دعوت کا عمل ہر قربانی اور ایثار کے جذبہ کے ساتھ انتہائی مستقل مزاجی کے ساتھ جاری وساری تھا۔ یہی وہ تشکیلی دور ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے وحی الٰہی کی روشنی میں صحابہ کرامؓ کی صورت میں وہ قوت و جمعیت فراہم کی جو کسی بھی نظام سے ٹکرانے یا بالفاظ دیگر مسلح یا غیر مسلح اقدام کے لیے شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

مکی دور میں نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ مشرکین کے مظالم کے جواب میں صبر واستقامت کی روش پر گامزن ہیں اور اس کے برعکس مدینے میں ایک ایسا وقت آیا کہ ابوسفیان نے دربار نبوی ﷺ میں دست بستہ حاضر ہو کر صلح کی درخواست کی۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے صلح نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل وحی الٰہی کی روشنی اور نبی اکرم ﷺ کی راہنمائی اور قیادت میں اختیار کیا گیا۔ مکی دور میں پوری جدوجہد پر ایک درویشانہ اور مظلومانہ رنگ غالب ہے جبکہ مدنی دور میں اقدامی اور جارحانہ روش دکھائی دیتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے اور اس کے پیچھے کیا حکمت کارفرما ہے؟ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اسلام نہ ہمیشہ امن اور صلح، صبر اور درگزر کی تعلیم دیتا ہے۔ اور نہ ہی ہر حال اور ہر جگہ جنگ وجدال اور جہاد وقتال پر اُبھارتا ہے۔ اسلام میں فی نفسہ نہ صلح مطلوب ہے نہ قتال بلکہ یہ دونوں ایک خاص مقصد کے لیے حکمت عملی کے طور پر اختیار کیے جاتے ہیں اور وہ خاص مقصد ہے۔

اظہار دین حق، اقامت دین، قیام خلافت، حکومت الٰہیہ کا قیام وغیرہ غرض نام اور اندازِ تعبیر مختلف ہیں مگر ان سب سے ایک ہی حقیت کا اظہار مطلوب ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے درج ذیل آیت کو سیرت النبی ﷺ کا عمود قرار دیا ہے۔ یعنی وہ نقطہ جس کے گرد پوری تیئس سالہ جدوجہد گردش کر رہی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهُ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهِ

(التوبہ:۳۳، الفتح:۲۸، الصّف:۹)

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ (کتاب ہدایت) اور دین حق دے کر تا کہ غالب کر دے اُسے تمام نظام ہائے حیات پر''۔

اس آیت مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت بیان ہوا ہے۔ اس نقطہ کو سمجھ لینے کے بعد سیرت کے دونوں مراحل میں کوئی تضاد اور کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔ یعنی جب بھی جو طریقہ کار غلبہ دین کے لیے مناسب تھا، سیرت نبوی ﷺ میں وہی اختیار کیا گیا۔ جب تک مکہ میں رہے مسلمانوں کے پاس اس قدر قوت نہ تھی کہ کفر کی حکمرانی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے اور اس کی جگہ خدا کی حکمرانی قائم کرتے۔ اس لیے اقدام نہ کیا بلکہ مسلسل تن دہی کے ساتھ قوت کی فراہمی میں کوشاں رہے۔ ظاہر ہے یہاں قوت سے مراد صرف عددی قوت نہیں بلکہ ایسی عددی قوت کی فراہمی مطلوب ہے جو ایمان حقیقی سے وافر حصہ رکھتے ہوں اور عمل